علامہ سید سلیمان ندویؒ بحیثیت شاعر

پروفیسر مفتی ثناءاللہ محمود
اسلامیہ آرٹس کامرس کالج کراچی
Prof. Mufti Sana Allah Mahmod

ABSTRACT:

This paper seeks to euptain that Suleman Nadvi Possessed a very delicate taste of poetry but he rarely exhibited this art in his writings. His art of composing poetry was highly mature and serious enough to be considered as great poet if he had opted this wediin with devotion.

Simee eaolyhood he used to pasticipate in poetry competition at sehool level and sheured comriderable interest in composing poems. It is interesting to note that this mark of interest continued even in Nadvat-ul-Ulema as well. Soon his voice be come exceptional ameng remeuened peets. His style of writing seems to be very much influenced with Ameer Nini's classical toue. He neuer thought to publish his wool or collected his marvelous pieces. Feelings if gratitude must be paid to a deutee who made efforts to make wadvi's work published with grat entrust.

This paper further discusses different phases of syed's poetry.

First phase introduces his boyhood and early student life.

2nd phase relates to the specific peried when he stayed in Daerul Musanifen till he cames in the spositual Circele of Maulana Ashraf Ali Thanvi.

3rd phase cause the later period fill his death.

It have fried to purent few pieces of syed's poetry with the appraisal of Allama Iqbal. In this effort of mine in have fined to ceuer awry possible expulsion of his poetry including sophistic and (NATIA).

Syed has never been in support of adopting the medium of poetry in a consistent way for the reason that Azmat Ali Redi Allah Anho Iman Shefar Rahmat Ullah Hllah and many others have alread Shoueed their dislileemss for poetry as prime medium Kneveledge for them, was a better choice to be fitted with

تاریخ علم وادب میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کو ایک باکمال عالم، محقق، مؤرخ وسیرت نگار کی حیثیت سے شہرت ملی، اور اس حیثیت سے ان کی شہرت وعظمت کے سامنے ان کی دوسری مثالی ادبی، شعری اور تنقیدی حیثیت زیادہ مشہور نہ ہوئیں، اب رفتار زمانہ نے انہیں ایک ادیب و انشاء پرداز کی حیثیت سے تو تسلیم کر بھی لیا ہے۔ لیکن ان کے بلند شعری ذوق اور معیاری مذاق سخن گوئی کا علم اب بھی کچھ ہی لوگوں کو ہے، حالانکہ سید صاحب کے کلام میں ناسخ کی مہارت زبان، شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی، آتش کی مرصع سازی اور جوہر مردانگی، شاہ نصیر اور ذوق کی صنعت گری اور فنی کاوش، داغ کا منفرد لب ولہجہ، امیر مینائی کی شستگی اور بیان کی صفائی اور جلال کا زبان غرض وہ سب کچھ ہے جن کا لکھنوی دبستان شاعری کے نمایاں اور اہم امتیازات میں شمار ہوتا ہے۔

اس کی بے شمار وجوہات ہیں، دراصل سید صاحب نے ایک باکمال شاعر ہونے کے باوجود کبھی اس کا اظہار پسند نہیں کیا، اور ہمیشہ اپنے اس ذوق کو ایک ''جرم'' اور ''عیب'' قرار دے کر ''رمز'' و اشارے کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔(۱) لیکن ان کے ایک عاشق غلام محمد نے ''ارمغان سلیمان'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام مرتب کر کے کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع کر دیا۔ اسطرح یہ مہر بند خزانہ اب عام ہو گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر سید صاحب نے شاعری کو خیر باد نہ کہہ دیا ہوتا تو اس میدان میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا۔ مگر تحقیق و تصنیف نے شاعری کی طرف توجہ ختم کر دی اور علمی و تحقیقی کارناموں کی آب و تاب میں ان کی شاعری ماند پڑ گئی۔(۲)

شاعری پر تبصرہ

سید صاحب کے اس کمال اور مہارت کی طرف کسی نے توجہ نہیں لی، غالباً سب سے پہلے سید حسین نے معارف کے سلیمان نمبر میں ''حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں سید صاحب کے صرف اس عہد کا کلام زیر بحث لائے جب وہ مولانا تھانویؒ سے مرید ہوئے۔ اور ان کے جذبات و واردات قلبی شعر کے قالب میں ڈھل رہے تھے۔ اس کے بعد غلام محمد صاحب نے ارمغان سلیمان کے مقدمہ میں سید صاحب کی شاعری پر مختصر اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ تیسرا اور غالباً آخری مضمون شاہ معین الدین ندویؒ کا ہے جو رسالہ معارف جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں کافی وضاحت کے ساتھ سید صاحب کے مرتبہ، شاعری اور ان کے ذوق شعر و سخن کا مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بچپن میں شاعری سے دلچسپی

سید سلیمان ندویؒ کو صغر سنی میں بیت بازی سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس میں پیش پیش رہتے تھے۔ شعر و شاعری سے ان کے ذوق کی بنیاد ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اسی بیت بازی سے پڑی۔(۳) بقول مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے بہار میں یہ عام دستور

تھا کہ کسی گاؤں میں جب دوسرے گاؤں سے بارات آتی تھی تو بچے شعروشاعری کا مقابلہ کرتے تھے۔اس معرکہ کا نام اس زمانے میں ''بیتا بحث'' ہوتا تھا۔ برات آنے سے چند ماہ پہلے ہی مکتب خانے کے بچے اس بیتا بحث کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے۔کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہوکر بیت بازی کرتے اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا۔اس زمانے میں کچھ کتابیں بھی اس سلسلے میں معروف تھیں۔جن سے اس مقابلہ میں بڑی مدد ملتی تھی۔ بچے ان ہی کتابوں کے اشعار زبانی یاد کرتے (۴) سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے جن مکاتب میں حاصل کی ان میں بیت بازیوں کا بڑا زور تھا۔ چنانچہ وہ ان میں نہ صرف پوری تیاری اور ذوق وشوق سے شریک ہوتے بلکہ اپنے گروہ کے کے لیڈر اور سربراہ بنائے جاتے۔ ابوظفر ندوی لکھتے ہیں:

> ''علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور ان کے مشیر خاص حکیم نجم الہدیٰ ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے خاص لگاؤ ہوگیا اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے۔''(۵)

بیت بازی کے سلسلہ میں سید صاحب نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی۔جس میں بلا مبالغہ ہزاروں اشعار درج تھے۔اس بیاض کے ایک جانب عربی اور دوسری جانب اردو اشعار تھے۔(۶) چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے اس لئے سید صاحب کو تقطیع کی طرف بھی خاص توجہ کرنا پڑی اور اس کے باعث ان کو فن عروض پر اس قدر عبور حاصل ہوگیا تھا کہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔(۷)

نوجوانی میں شعروشاعری

گاؤں کی مکتبی زندگی سے نکل کر وہ ۱۸۹۸ء میں مزید تحصیل علم کے لئے پھلواری

شریف (پٹنہ) آئے۔ یہاں خانقاہ مجتبیٰ میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ جس کے اثر سے پورے قصبہ میں شعروسخن کا ذوق عام تھا۔(۸) مزید براں پھلواری میں سید صاحب کا قیام جس کمرے میں تھا اس کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبداللہ رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی معشوق ایک پرگو شاعر تھے۔ ان کے کمرے میں ہر وقت شعروشاعری کا چرچا رہتا تھا۔ سید صاحب بھی بہت دلچسپی اور شوق سے اس مجلس میں شریک رہتے۔ بیت بازیوں سے اس کا چسکہ تو پہلے ہی پڑ چکا تھا۔ اب یہاں کی قوالی کی محفلوں میں شرکت اور اس ماحول نے ان کے شعروسخن کو اور جلا عطا کی۔ وہ خود اپنے ایک ریڈیائی مضمون میں رقم طراز ہیں:

''یہاں (پھلواری شریف) خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعروشاعری کا چرچا تھا اور ہے۔ میں نے بھی اس فضا میں سانس لیا، اور یہیں میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول ''منصور ہوہنا'' دیکھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔(۹)

ندوۃ العلماء میں

بہار کی مختلف درس گاہوں میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد جب ۱۹۰۱ء میں سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے لئے لکھنؤ پہنچے تو گویا شعروسخن کے اصل گہوارہ میں آ گئے۔ خود ندوہ میں شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا، طلبہ اکثر مشاعرہ کرتے تھے، جس میں رکن الدین دانا، تجمل حسین شاہ جہانپوری، مصطفیٰ خاں ملیح آبادی، عبدالغفور شرر، سید عثمان گیلانی، ظہور احمد وحشی اور مولانا عبدالسلام شمیم (صاحب شعرالہند) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا طرحی یا غیر طرحی کلام سناتے تھے۔(۱۰) لکھنؤ کی اس شعر پرور فضا میں ان کی شاعری کا نشہ دو آتشہ ہو گیا اور ان کا ذوق سخنوری نکھر کر درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔ شاہ معین الدین احمد ندویؒ رقم طراز ہیں:

''جس زمانہ میں سید صاحب مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے لکھنؤ کی پوری فضا پر شاعری چھائی ہوئی تھی۔ اس فضا نے سید صاحب میں شاعری کا نشہ تیز کر دیا اور وہ خود بھی شعر کہنے لگے۔(۱۱)

سید ابوظفر ندویؒ لکھتے ہیں:

''اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلال، ریاض اور مضطر وغیرہ بقید حیات تھے۔ عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف تھا، ''پیام یار'' نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، مرثیے کی محفل اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ علامہ موصوف ان میں شرکت کرتے کرتے خود بھی شعر کہنے لگے، اور بالآخر ایک باکمال شاعر بن گئے''۔(۱۲)

امیر مینائی مرحوم سے قلبی تعلق

سید سلیمان ندویؒ کے دل میں امیر مینائی مرحوم کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اور ان کو امیر مینائی کے سینکڑوں اشعار نوک زبان یاد تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی امیر کے ماہر فن ہونے اور تحقیق لغت و زبان کے تو معترف تھے، لیکن ان کی غزل گوئی کے زیادہ قائل نہ تھے۔ لیکن سید صاحب کی زبان سے امیر کے منتخب اشعار سن کر ان کو اپنی رائے میں تبدیل کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنا اور سید صاحب کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل کیا ہے اس مکالمہ کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''سید صاحب سے ربط و رسم ایک مدت سے قائم تھا۔ ان کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا کلام امیر کا حافظ نکلے گا۔ مرآۃ الغیب کا آئینہ دار، صنم خانہ عشق کا پرستار یہ پہلی

بار کھلا کہ حضرت بایں زہد وتقویٰ اور اردو شعر وسخن کے رسیا ہیں اور اردو غزل و تشبیت کے متوالے۔" (۱۳)

اسی باعث سید صاحب کے ابتدائی دور کے کلام پر امیر مینائی کے رنگ سخن کے بہت نمایاں اور گہرے اثرات ملتے ہیں۔ وہی کلام کی ندرت، تازگی اور لطافت اور وہی حسنِ زبان، نزاکت اور لوچ جو امیر کے امتیازی خصائص شعری شمار ہوتے ہیں سید صاحب کے ابتدائی دور کے کلام میں درجہ کمال پر ملتا ہے۔ (۱۴)

۱۹۱۲ء میں جب علامہ شبلیؒ نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی تو سید صاحب نے اس میں بھی استاذ کی اتباع کا حق ادا کیا اور علامہ شبلیؒ کی رحلت کے بعد متعدد نظمیں ہو بہو شبلیؒ رنگ میں لکھیں اور اہل فن سے استاذ کی ہم رنگی پر داد پائی چنانچہ "نوحۂ استاذ" کے بارے میں نواب عماد الملک نے انہیں لکھا تھا۔

"آپ کی نظمیں علامہ شبلیؒ کی یاد تازہ کرتی ہیں"۔ (۱۵)

سید صاحب کی شاعری منظر عام پر

عرصہ دراز تک گمنامی میں رہنے کے بعد سید صاحبؒ کی شاعری منظر عام پر آئی اور سید صاحبؒ کے ایک عاشق جناب غلام محمد نے جولائی ۱۹۶۶ء میں کراچی سے ارمغان سلیمان کے نام سے ان کا مجموعہ کلام مرتب کر کے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ متوسط تقطیع کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس میں سید صاحب کے شاعرانہ مرتبہ کو نمایاں و متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مرتب کو اعتراف ہے کہ:

"یہ مجموعہ سید صاحب کے مشق سخن کا پورا سرمایہ نہیں بلکہ انکی قلمی بیاض کی پوری پوری نقل ہے۔ اگر اضافہ ہے تو چند ایک قطعات یا ان نظموں کا جو کہیں اور چھپی ہوئی مل گئیں۔ (۱۶) ارمغان سلیمان میں دور آخر (جو

روحانی شاعری پر مشتمل ہے) کا کل خزانہ محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن دور اول کی قدیم ترین غزل اس مجموعہ میں ۱۹۰۴ء کی ملتی ہے۔ جبکہ گزشتہ صفحات میں ذکر آ چکا ہے کہ یہ سید صاحب نے پھلواری شریف کے زمانے میں قیام ۱۸۹۹ء ہی سے طرحی اور غیر طرحی مشق سخن شروع کر دی تھی۔ لیکن اس زمانے کے کلام کا سراغ نہیں ملتا۔''

بلوی غلام محمد نے لکھا ہے

دور اول کے ذخیرہ کے متعلق یقین نہیں آتا کہ شعر و سخن کی گرم بازاری اور سخن سنج جواں عمری کا حاصل صرف اتنا ہی ہوگا۔ ممکن ہے خاصہ محفوظ نہ رہ سکا ہو، اس گمان کو تقویت یوں بھی ملی ہے کہ اس مجموعہ میں ایک غزل بھی ایسی نہیں ملتی جس میں کہیں تخلص بھی آیا ہو۔ (۱۷)

سید صاحب کا تخلص

سید صاحب کے تخلص کا معاملہ بھی بڑا پیچیدہ ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ''رمزی'' تخلص بتایا ہے۔ (۱۸) موصوف اپنے اس خیال میں بالکل منفرد ہیں۔ غالباً مولوی غلام محمد نے بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''علامہ کے رفقاء کا کہنا ہے کہ وہ ''رمزی'' تخلص سے غزلیں کہا کرتے تھے۔ (۱۹)

جناب ڈاکٹر نعیم صدیقی لکھتے ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا کوئی تخلص نہ تھا۔ عبدالماجد صاحب کا ''رمزی'' تخلص قرار دینا غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ سید صاحب اپنا بعض کلام معارف میں شائع کرتے تو اس کے نیچے واوین میں ''رمزی'' لکھا کرتے تھے، مثلاً نظم ''متاع حق گوئی کی بازار جہاں میں ارزانی'' (معارف فروری ۱۸ء) اور ''درس مساوات'' (معارف اگست ۱۸ء) کے آخر میں بائیں جانب ''رمزی'' لکھا ملتا ہے۔ اسی طرح اکتوبر ۱۶ء کے

معارف میں ''رمزیات'' کے عنوان سے کچھ اشعار درج ہیں اور اس کے نیچے بھی ''رمزی'' تحریر ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا گیا کہ شاید سید صاحب کا تخلص یہی ہے۔ حالانکہ اس لفظ کو انہوں نے محض ''سخن کا پردہ'' بنایا تھا۔ جیسا کہ سید صاحب خود ہی لکھتے ہیں:

''اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا۔ اگر چھپ نہ سکا چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا۔ (۲۰)

شاہ معین الدین احمد ندوی رقم طراز ہیں:

''وہ ایک عرصہ تک محض تفنن طبع کے طور پر شاعری کرتے رہے اور اس کو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی اس لئے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا اور جو غزلیں اور نظمیں شائع کیں، وہ ''رمزی'' کے پردے میں ہیں۔ (۲۱)

مگر دوسرے قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ ''رمزی'' محض ایک مفروضہ تخلص ہے جس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک چلن تھی جس کے پیچھے سید صاحب خود کو چھپانے کی کوشش ضرور کرتے، مگر ارباب نظر کی نگاہوں سے مستور نہ ہو پاتے تھے۔ (۲۲)

سید صاحب کی شاعری کے ادوار

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا جو مجموعہ کلام ہمارے سامنے ہے اس میں قدیم ترین اشعار ۱۹۰۴ء کے ہیں اور مؤخر ترین اشعار ۱۹۴۹ء کے۔ اس طرح ان کی شاعری کی مدت تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں ان کی شاعری کا سوتا دوسرے ہم عصر باقاعدہ شعراء مثلاً حسرت موہانی، فانی، اصغر اور جگر کی طرح بلا انقطاع مدت مسلسل جاری نہیں رہا۔ بلکہ درمیان درمیان میں اس کی خشکی کے وقفے بھی آتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں شعر گوئی سے طبیعت بالکل ہٹ گئی تھی۔ صرف حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سے ان کی رحلت تک کے درمیانی سوا سالہ زمانہ میں سید صاحب کے جذبات اور واردات قلبی میں جو جوش اور اُبال پیدا ہوا اس کے نتیجہ میں ایک وافر

سرمایۂ شاعری وجود میں آ گیا۔ جو باقی عہد کے ذخیرۂ سخن پر کمیت اور کیفیت دونوں حیثیت سے فوقیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ارمغان سلیمان کے مرتب نے سید صاحب کے کلام کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دور اوّل میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۵ء تک کا کلام شامل ہے۔ اور دور آخر کا کلام اپریل ۴۲ء سے دسمبر ۴۹ء تک پر مشتمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے رنگ سخن اور ذوق شعری کے تدریجی ارتقاء کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کو تین ادوار میں منقسم کرنا چاہئے۔ (۲۳)

سید صاحب کی شاعری کا پہلا دور

پہلا دور زمانہ طالب علمی کی شاعری اور مشق سخن پر مشتمل ہے۔ اس دور کو ان کا تربیتی دور کہا جاسکتا ہے۔ جب سید صاحب لکھنوی رنگ تغزل کے دلدادہ اور امیر مینائی کے مراۃ نصیب کے پرستار تھے۔ اسی کی کامیابی نقالی اور اتباع وتقلید میں ساری طباعی صرف کرتے، چنانچہ ان کے ابتدائی عہد کا کلام بھی اسی رنگ وآہنگ کا مکمل نمونہ ہے۔ زبان وبیان کی سلاست وصفائی کے ساتھ اشعار میں نزاکت اور لوچ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں لکھنوی دبستان سخن کا طرۂ امتیاز یعنی خارجیت کا میلان اور رنگینی، شوخی اور رعنائی خیال کی خصوصیات اس پر مستزاد تھیں۔ اس عہد کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

دست نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری — بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری
چین سے بیٹھنے دے گی نہیں ہم دونوں کو — تجھ کو یہ شوخی تیری، مجھ کو یہ وحشت میری
چاہے تم آج نہ ہو میری وفا کے قائل — پر تمہیں یاد آئے گی کبھی یہ الفت میری

بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے — اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار — اب کیوں شب وصال وہ شرمائے جاتے ہیں

اُدھر گلچیں خفا ہے اور ادھر بیتاب ہے بجلی — خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا

اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں نیا انداز یہ سیکھا ہے تم نے دل اڑانے کا

دوسرا دور اور علامہ اقبال کی شاباش

سید صاحب کی شاعری کا دوسرا دور قیام دارالمصنفین ۱۴ء کے بعد سے شروع ہوا اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ارادت یعنی ۴۲ء تک قائم رہا۔ اس دور کے کلام میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے، اب ان کی شاعری محض گل و بلبل اور ہجر و وصال کی داستان نہیں رہ گئی۔ بلکہ ان کے جذبات میں لطافت اور خیالات میں معنویت اور گہرائی پیدا ہوگئی۔

سید صاحب نے ۱۹۱۶ء میں ایک غزل اعظم گڑھ کے کسی مشاعرہ کے لئے کہی تھی جس کا مطلع ہے

یہ غزل جب ڈاکٹر علامہ اقبال کی نظر سے گزری تو انہوں نے سید صاحب کو اس کی داد دیتے ہوئے ایک خط میں لکھا:

''آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا۔''

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے (۲۴)

اسی غزل کا درج ذیل شعر بیت الغزل کہلانے کا مستحق ہے۔

دھن میں تیغ کے ہے اب بھی تشنگی باقی عجیب لذت پنہاں میرے لہو میں ہے

مولانا جوہر کی نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی نظم

جون ۱۹۱۷ء میں مولانا محمد علی جوہرؒ نے ایک غزل عبدالماجد دریابادی کو جیل سے لکھ کر بھیجی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

اس غزل سے متاثر ہو کر اس کے تتبع میں مولانا دریابادی اور سید صاحب دونوں نے بڑی مرصع غزلیں کہہ ڈالیں۔ سید صاحب کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

تشہیر کا باعث نہ ہو دامان قبا دیکھ لائے نہ کہیں رنگ یہ خون شہداء دیکھ

یہ عالم امکاں ہے تماشا گہ قدرت — لائے نہ کہیں رنگ یہ خون شہداء دیکھ
تاثیر وفا دعویٰ باطل ہے سراسر — اب شوخ ستمگار پہ کچھ کر کے جفا دیکھ
انکار تھا تجھ کو میری تاثیر دعا سے — اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ
نکلے گا وہ خورشید جمال آج ادھر سے — اڑ جائیں مری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ
مقبول ہوائے یوسف زنداں مراتحفہ — لایا ہے جو پیغام ہر شہر سبا دیکھ

دوران سفر شاعری کا جوبن پر آنا

سفر میں انسان کی اندرونی کیفیات ابھرنے لگتی ہیں، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ مرحوم کہیں سفر پر جاتے اور ٹرین پر سوار ہوتے تو ان کے ذوق شعری کے دبے ہوئے جذبات ابھر آتے اور وہ اپنی بیاض نکال کر اس میں اشعار قلمبند کرتے جاتے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح دوران سفر میں وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ ''راز رون پردہ'' مظفر پور کے سفر کے دوران کہی گئی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں

یہ کیسی بے کسی ضبط محبت کی الٰہی ہے — کہ اس کا نام بھی میری زباں تک آ نہیں سکتا
تمہیں کو کس طرح میری محبت کا یقیں آئے — قسم تک تو تمہارے نام کی میں کھا نہیں سکتا
یہ ہم دونوں سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں سمجھتے ہیں — کہ جو راز روں ہے کوئی اس کو پا نہیں سکتا

اس کے بعد ۱۹۳۸ء تک سید صاحب کی کل اٹھارہ غزلیں ملتی ہیں جو تقریباً سب کی سب سفر کے دوران کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں

عقل کہتی ہے کہ ناداں نہ ہو گمراہ نہ ہو — عشق کہتا ہے کہ کیا لطف اگر چاہ نہ ہو
سوزش عام ہو تب آگ سے اٹھتا ہے دھواں — عشق کہتا ہے کہ کیا لطف اگر چاہ نہ ہو
نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ — سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے
یہ آبگینے مجھ کو نہایت عزیز ہیں — اے خار دشت آبلہ کوئی نہ پھوٹ جائے

اظہار جذب عشق پہ مائل تو ہوگئے تیرا اثر کہ آج وہ گھائل تو ہوگئے
مضطر وہ برق دش تھا اٹھنے کو خود حجاب ہم آپ درمیان میں حائل تو ہوگئے

حرف مطلب کہا نہیں جاتا بے کہے بھی رہا نہیں جاتا
نگہ لطف سے نہ دیکھ مجھے یہ ستم بھی سہا نہیں جاتا
عشق کی تازگی ہے آنسو سے بے سبب تو بہا نہیں جاتا

یہ کیسی آگ ہے سینہ میں دب دب کر سلگتی ہے ذرا دامن سے دی تم نے ہوا اور دل میں لگتی ہے
نہ بجھ جانے کی رخصت ہے نہ جل جانیکی ہمت ہے سلگ کر پھر وہ بجھتی ہے وہ بجھ کر پھر سلگتی ہے

یہ دل وہ شیشہ نازک ہے میرے سینے میں نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے
نگاہ شوق ذرا دیکھ بھال کر اٹھے چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے

ان اشعار سے یہ بات عیاں ہو رہی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سید صاحب کے خیالات میں رفعت، جذبات میں شدت اور زبان و بندش میں صفائی اور پختگی آتی گئی، لیکن بنیادی طور پر وہ اب بھی اسی رنگ سے ہم رنگ رہے جسے شعر و ادب کی تاریخ میں ''لکھنویت'' سے یاد کیا جاتا ہے۔

ان کی شاعری پر امیر مینائی مرحوم کے گہرے اثرات کی وجہ سے وہ مکمل طور سے لکھنویت سے اپنا دامن دوسرے دور میں بھی نہ چھڑا سکے تھے۔ وہی رنگ وہی شوخی جس پر لکھنوی شعراء تنقید کا نشانہ بنے ہیں سید صاحب باوجودیکہ زہد و تقویٰ کے پیکر تھے ان کا کلام بھی اس سے خالی نہیں، کہتے ہیں ؎

کل شب میرے نہ آنے سے خفگی بجا سہی دست گستاخ کو اجازت دو
ہے کیوں نگاہ ناز مگر شرم سار آج منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا

ہماری پاکبازی کی سند پر مہر ہوتی ہے رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں

مجھے جب بوسہ لب سے وہ شاد کرتے ہیں ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہوگئے

گیسو سنگھا کے ہوش میں کیوں لا رہا ہے تو

یوں ہی تو چھوڑ دے مجھے اے یار چھوڑ دے

حکیم الامت تھانویؒ سے تعلق کے بعد کی شاعری

سید صاحب کی شاعری میں عارفانہ اور تصوفانہ کلام کا رنگ تو تھا ہی لیکن آستانہ اشرفی سے تعلق کے بعد ان کے جذبات شوق میں جو شدت اور وفور پیدا ہوا، وہ زبان سے شعر و نغمہ بن کر ابلنے لگے۔

اس زمانے کے مقرب عینی شاہدین کا بیان ہے کہ ارادت کے بعد سید صاحب میں اتنا غیر معمولی تغیر ہوگیا کہ وہ ہر مجلس میں بلکہ ہر وقت نغمہ خوانی کرتے رہتے تھے۔ جب کہ اس سے پہلے یہ حالت نہ تھی۔(۲۶) جذبات کی شدت و فراوانی اور اشعار کی کثرت آمد کا یہ عالم تھا کہ کبھی ایک دن میں کئی کئی غزلیں موزوں ہو جاتی تھیں، جب کسی نشست میں وہ عارفانہ اشعار پڑھتے تھے تو سامعین کو تڑپا دیتے تھے۔ اس عہد کے وفور جذبات کے بارے میں غلام محمد خود سید صاحب کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

> ''میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والا (تھانوی قدس سرہٗ) کے تعلق سے ہوا اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہوگیا بعد میں مشکل سے دو چار غزلیں ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرتؒ کی موجودگی میں جذبات کا وفور رہتا تھا۔ جو پھر باقی نہیں رہا۔''(۲۷)

سید صاحب نے اپنے عارفانہ کلام کے مجموعۂ کلام کا نام ''نغزل الغزلات'' خود تجویز کیا تھا۔ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لاہوتی نغمات کا عنوان تھا۔(۲۸) اس اشتراک اسمی سے

فائدہ اٹھانا ان کے حسن ذوق کا بین ثبوت ہے۔ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ کلام اس نام کا مستحق ہے۔ ''غزل الغزلات'' کو سید صاحب اپنا ''روحانی سفرنامہ'' کہا کرتے تھے، اور فی الواقع اس میں راہ سلوک و معرفت کے ہر مرحلہ کے نشانات ملتے ہیں۔ (۲۹) ارمغان سلیمان کا یہ حصہ ۳۹ غزلیات، ۳ قطعات اور ایک فرد پر مشتمل ہے اور ہر ایک کے خاتمہ پر تاریخ اور مقام تحریر درج ہے۔ کل اشعار کی مجموعی تعداد ۳۱۶ ہے۔ ان اشعار سے شاعر کے روحانی ارتقاء اور عارفانہ مشاہدات کی تفصیل بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رقم طراز ہیں:

''اس دور کا کلام تمام تر قلبی واردات کا ترجمان اور بادۂ عرفان کا چھلکتا ہوا جام ہے۔ اس میں طور کی تجلیاں اور وادیٔ ایمن کی شرر باریاں نظر آتی ہیں''۔ (۳۰)

سید صاحب نے اپنے اشعار میں معرفت اور تصوف کے مسائل کو محض روایتی طور پر نظم نہیں کیا ہے بلکہ درحقیقت وہ ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے۔ سید صاحب بادۂ تصوف اور مئے عرفان سے مست و سرشار تھے، اور انہوں نے اپنے وارداتِ عشق اور سفر معرفت کی روداد ہی کو شعر کے قالب میں پیش کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد کے کلام میں انہوں نے محض موزونی طبع اور قدرتِ بیان کا کرشمہ نہیں دکھایا بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ وہ خود کہتے ہیں

جو شعر بھی سپرد قلم کر رہا ہوں میں سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

روحانی سفرنامہ

اب ذیل میں ان کے روحانی سفرنامہ کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں، تصوف کا دارومدار عشق پر ہے۔ بغیر اس کے منزل مقصود تک پہنچنا محال ہے۔ بالخصوص چشتیہ عالیہ سلسلہ میں تو اوّل و آخر بس عشق ہی عشق ہے۔ اس لئے سید صاحب کی روح بھی وادی سلوک و معرفت میں آ کر سوز و گداز عشق اور وجد و کیف سے معمور ہوگئی ہے اور پھر ان کی روح کے تار پر جو زخم بھی لگا وہ

زبان کا نالہ یا دل کا نغمہ بن گیا۔ خود ہی کہتے ہیں

نغمہ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی جو کبھی گاتی نہ تھی وہ وجد میں گانے لگی

سید صاحب کے عارفانہ اشعار میں بھی عشق مجازی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے مرشد اور محبوب حقیقی کو بھی مجازی محبوب تصور کر کے ان سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ (۳۱) ملاحظہ فرمائیں

جس دن سے مرے دل میں تیری یاد بسی ہے ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو دوری مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں
سجدے میں رکھ کر سر ترے پائے خیال پر تعمیر ایک بہشت ارم کر رہا ہوں میں
کہہ کہہ کے دل فریب دل آراء و دل نشیں تردید قصہ ہائے ستم کر رہا ہوں میں

یاد ان کی دم بدم نہیں آتی کیا مزاج یار برہم ہو گیا

دل ہے اے ناداں تجلی گاہ دوست کیوں نگاہ شوق سوئے بام رہے

گاہ دیکھا تھا مری چشم تصور نے تمہیں اب وہی تصویر میری ہمدم و دم ساز ہے

مرشد سے تعلق پر اشعار

مرشد سے کمال محبت، اس کی خانقاہ کے در و دیوار سے عقیدت، شیخ کی محفل اور ''چشم ساقی'' کے اثرات کے بے حد دلکش مرقعے ''غزل الغزلات'' کے ہر ورق پر ورق گل کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ عارفانہ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیت مستانہ آباد رہے یا رب تا حشر وہ مئے خانہ
زاہد نے کہاں پائی، زاہد نے کہاں پی لی گفتار ہے رندانہ، رفتار ہے مستانہ

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی آ دل میں مرے چھپ جا اے صورت جانانہ

ذرہ ذرہ عالم محسوس کا خاموش ہے۔ یار ہے گرم سخن محفل سراپا گوش ہے
چشم ساقی میں بھری کیا بادۂ سرجوش ہے جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مست ہے مدہوش ہے۔

کیا بھری تاثیر میں مطرب تیری آواز ہے جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا تن میں جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے
حیات نو مجھے اس کی نگاہ ناز نے بخشی بھرا ہے آب حیواں کاسۂ زہر ہلال میں
جو موسیٰ بھی ہوں تو بھی اتباع خضر لازم ہے ہدایت منحصر ہے اتباع شیخ کامل میں

دل کی آگ خرد کے دامن پہ

دل کے انوار و تجلیات سے معمور ہو جانے کے بعد خارجی دنیا کے تمام مظاہر اور سرمایۂ خرد ہیچ نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ہوش و خرد کا جو خرمن جمع کیا تھا اس کو بھی آگ لگانے کو تیار ہو گئے

تیرے اک چھینٹے سے اے ابر بہاری ان دنوں سبز ہے، شاداب ہے، سراب ہے، گلزار دل
دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خار دل
عشق کا رہبر دلیل راہ جس دن سے بنا بن رہا ہے آپ ہی کا انکار دل، اقرار دل
ہوش ہے، گرمی و مستی ہے، وفور شوق ہے شکر ہے رونق پہ ہے امروز کار و بار دل

ذکر اللہ اور ندویؒ کی شاعری:

کثرت ذکر سے جب رگ و پے میں حق ہی حق سرایت کر جاتا ہے تو ہر چیز میں حق کا ظہور اور ہر آواز میں حق کی پکار محسوس ہونے لگتی ہے، اور ہر موئے بدن ساز حقیقت بن جاتا ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو "سلطان الاذکار" کہتے ہیں۔

کس نے پھر دی یہ صدائے دلنواز ہر رگ جاں ساز الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں ہر صدا آواز الااللہ ہے
ہے اسی کی سانس انفاس حیات جو کوئی دم ساز الااللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند قلب ذکر ساز الااللہ ہے
وجد میں جاں ہے تو اعضاء رقص میں جام مئے آواز الااللہ ہے

۱۹۴۹ء میں سید صاحب آخری بار سفر حج کے لئے مکہ معظمہ پہنچے تو اس ارض قدس میں قدم رکھتے ہی ان کے ذوق وشوق کے سمندر میں طغیانی آ گئی، اور اس عالم میں ایک نہایت والہانہ غزل کہی، جس کے اوپر اپنے قلم سے ''بوقت حاضری مکہ معظمہ'' تحریر کیا ہے۔ نمونہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

دیدۂ دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں
ان کے کرم پہ ہم نثار، ان کی عطا کا کیا شمار دے دیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں
دل کو نصیب ہو گداز، جاں کو عطا ہو سوز وساز ہے یہ دعا بصد نیاز درگہ بے نیاز میں

وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو درج ذیل قطعہ میں کس کیفیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ قطعہ ''اللہ نور السموات والارض'' کی تفسیر اور سید صاحب کے ''سر الااللہ'' کا آئینہ دار ہے ؎

جہاں دیکھیں وہاں پائیں جہاں دیکھیں تو ہی تو ہے تجھے جو یاد کرتا ہے اسی کا ہم نشیں تو ہے
تری ہی روشنی چارسو پھیلی ہے عالم میں کہیں مہر فلک تو ہے کہیں نور زمیں تو ہے

حکیم الامت تھانویؒ کی وفات کے بعد

جولائی ۴۳ء میں حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کا سانحہ ارتحال امت مسلمہ کے لئے ایک عظیم حادثہ جانکاہ تھا۔ جس نے ان کے خانوادہ کے بڑے بڑے حضرات کے دلوں کو بھی دہلا کر رکھ دیا تھا اس کا اثر ظاہر ہے، مولانا ندویؒ پر بھی گہرا پڑا چنانچہ ان کا چشمہ سخن بالکل

خشک ہوگیا اور شاعرانہ جذبات سرد ہوکر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد دس سال کی طویل مدت میں انہوں نے صرف دو نعتیں اور سات آٹھ غزلیں کہیں۔ لیکن جو جذباتی ہیجان ارادت کے بعد ان میں پیدا ہوا تھا، اس کا جلوہ پھر تادم واپسیں نظر نہ آ سکا۔

سید صاحب کا اس دور کا کلام بظاہر سلیس اور آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت معنوی اعتبار سے بہت عمیق اور دقیق ہے۔ اسی لئے سید صاحب نے ''غزل الغزلات'' کے حاشیہ میں بہت سے اشعار کے رموز و کنایات کی تشریح کردی ہے، اور بعض مقامات پر ان کے مذاق آشنا مرتب دیوان نے بھی حاشیہ آرائی کی ہے۔

سید صاحب کے عارفانہ کلام کا جو نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے ارباب نظر کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہاں معرفت اور مسائل تصوف کا بیان محض ''برائے شعر گفتن'' نہیں ہے، بلکہ شاعر نے اپنے دل کی دنیا میں ڈوب کر یہ اشعار کہے ہیں۔ ان میں جو سوز و گداز، جذبات کی شدت و فراوانی اور صداقت و واقعیت موجود ہے۔ وہ ان کے نکتہ چینوں کو بھی اعتراف حقیقت پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر شاعری جذبات کی بہترین ترجمانی کا نام ہے تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ سید صاحب کے عہد آخر کا کلام اس کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔

سید صاحب نے غزل کے علاوہ نعت، قومی نظمیں، مراثی، قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں جن سے ان کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں آخری بار سفر حج کے موقع پر جب وہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو روضۂ اطہر کے روبرو پہنچتے ہی ان کا چشمۂ حبِ رسول نعت کی شکل میں اُبل پڑا، چونکہ وہ نرے شاعر نہ تھے بلکہ مقام نبوت کے مرتبہ شناس اور اوصاف و خصائص نبوت کے عارف و امین بھی تھے۔ (۳۲)

نعت گوئی

سیرت نبوی ﷺ کی خدمت اور اس کے احیاء و اشاعت میں صرف کردیں اس لئے ان کی نعتوں میں شاعری سے زیادہ حقیقت کا بیان ہے۔ مدینہ طیبہ کی حاضری کے وقت بارگاہ

رسالت میں جو نعت پیش کی اس کے چند اشعار یہ ہیں

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو — خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے
اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ — بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی — محبوب خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے

اور پھر جب حج سے فارغ ہو کر وطن واپس آ رہے تھے تو جہاز پر ایک دوسری نعت کہی، جس کے چند اشعار یہ ہیں

عشق نبوی درد معاصی کی دوا ہے — ظلمت کدہ دہر میں وہ شمع ہدی ہے
آمد تری اے ابر کرم رونق عالم — تیرے ہی لئے گلشن ہستی یہ بنا ہے
فرمان دو عالم تری توقیع ہے نافذ — تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے
لے جائیگا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور — جو جادہ سفر کا تیرے جادہ کے سوا ہے

صفت مرثیہ کی آفاقیت

ایک زمانہ تک صنف مرثیہ واقعات کربلا کے ساتھ مخصوص و محدود رہی۔ مولانا حالی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ جہاں اردو شاعری کے بہت سے دوسرے نقائص پر کاری ضرب لگائی وہیں اس بات پر بھی زور دیا کہ مرثیہ کو شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس میں مشاہیر قوم اور ارباب کمال کی موت پر بھی ان کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا جائے۔ (۳۳) چنانچہ حالی نے مرثیہ غالب لکھ کر شخصی مراثی کے سرمایہ میں ایک نہایت گراں قدر اضافہ کیا۔ سید صاحب نے بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کی وفات پر نہایت دلدوز اور اثر انگیز مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے۔ سا۔ بندوں اور باسٹھ اشعار پر مشتمل۔ سید صاحب کو اپنے استاذ سے جو غیر معمولی قلبی محبت اور عقیدت تھی، وہ اس کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اس میں ان کے سینہ کا گداز، قلب کا سوز، محبت و اخلاص اور درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھر گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے

کہ یہ پورا مرثیہ غم کا تاج محل ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

اے متاع عزت پیشیں کے پچھلے کارواں — آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں
جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی — جس کی ہر فریاد تھی صوت و رائے کارواں
جس کی اک اک بات تھی روح بلالی کی اذاں — جس کی رگ رگ میں تھیں سوز درد کی چنگاریاں
جس کے خامہ کی روانی میں نہایت رود فرات — جس کے ہر صفحہ کا دامن رشک دریائے عماں

کیا فریب صبر کھائے غم نصیب و دلفگار — جس کی دولت لٹ گئی کب اس کو دل پر اختیار
جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا — پھر دل اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار
یاد آئے جب وہ اس کا فقرہ نامختتم — ''آہ سیرت آہ سیرت'' چھوڑ کر سب کاروبار
پھر رُکے کس طرح پر شوری قلب مضطرب — کس طرح رُک جائے خوں نابی چشم اشکبار

کون اب بتائے مجھ کو طرز اعجاز بیاں — کون پھونکے اب مرے بے جان سے فقروں میں جاں
اب پر پرواز معنی کون بخشے گا مجھے — پشت مضمون کون پہنچائے گا اب تا آسماں
کون دیکھے گا مرا اب زور بازوئے قلم — کون دیکھے گا مری جولائی طبع رواں
کس کے نامہ کا بناؤں اب میں عنوان خطاب — 'سیدی'، 'مولائی'، 'استاذی'، 'غزالی الزماں'

جب یہ مرثیہ معارف نومبر ۱۶ء میں شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، مولانا حمید الدین فراہی اور اکبر الہ آبادی نے اس مرثیہ کو پڑھ کر مرثیہ نگار کی سخنوری، اور نوحہ سنجی کی داد دی، اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب کو لکھا:

''نظم پہنچی، نہ صرف آپ کی قابلیت کی شاہد ہے۔ بلکہ آپ کا دلی جوش ظاہر ہوتا ہے اور دل پر اثر پڑتا ہے۔''

مرکز امید تھا جو جب وہی جاتا رہا — اب پر پرواز معنی کون بخشے گا مجھے
کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکال فن — کون دیکھے گا مرا اب زور بازوئے قلم

کیا لاجواب شعر ہیں، معنی اور الفاظ دونوں لحاظ سے، اللہ تعالیٰ آپ کو سکون خاطر عطا فرمائے۔

اسی طرح جب ۱۷ء میں سید صاحب کی پہلی بیوی نے داغ مفارقت دیا تو دل کے پر درد نالہ اشعار میں ڈھل گئے۔ اپریل ۱۷ء کے معارف میں ''مرگ یار'' کے عنوان سے ۱۴، اشعار کا یہ دردناک مرثیہ شائع ہوا، جس کے چند اشعار یہ ہیں

درد اٹھ اٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے کیوں رگ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
یہ تماشائے جہاں خواب پریشاں ہی سہی پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہ ہوا
کس سے کیجئے دل شیدا گلۂ تنہائی مسند آرا میرے پہلو میں جو دلبر نہ ہوا
حیف اس خوں کی قیمت جو مژہ سے ٹپکے قطرۂ اشک ہوا گو ہراحمر نہ ہوا

علامہ اقبال کا مشہورہ

علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں مورخہ ۱۲، اکتوبر ۱۹۱۶ء کو لکھا تھا کہ:

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور جو چند نظمیں انہوں نے لکھی تھیں نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھا، سید صاحب نے اس نصیحت و مشورہ پر عمل کرتے ہوئے شبلی کے رنگ میں متعدد تاریخی نظمیں لکھیں۔ چنانچہ ''درس مساوات'' کے عنوان سے ایک تاریخی نظم میں خلیفہ ہارون الرشید کا درج ذیل واقعہ نظم کیا ہے:۔

''ہارون الرشید ایک بار مدینہ گیا، شاہزادہ امین و مامون بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہاں اس وقت حضرت انس بن مالک کا حلقہ درس حدیث اخبرنا کے زمزموں سے گونج رہا تھا۔ خلیفہ کی خواہش ہوئی کہ یہاں آ کر اس کے لخت جگر حدیث کے اس چشمۂ حیواں سے تشنہ کام نہ جائیں، چنانچہ اس نے امام مالک کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میرے لڑکے مجمع عام میں جا نہیں سکتے اس لئے آپ ''ایوان شاہی'' میں درس حدیث دیں

آرزو تھی یہ خلیفہ کو مدینہ جاکر جائیں محروم نہ اس در سے میرے لخت جگر
حکم پہنچا یہ خلافت سے کہ اے ابن انس مجمع عام میں جاسکتے نہیں میرے پسر
اس لئے آج یہ بہتر ہے تعلیم حدیث آپ دیں خاص انہیں ایوان شہی میں آکر

امام مالک نے ارشاد فرمایا

سن کے فرمان خلافت کا یہ ارشاد ہوا اے خلیفہ تری تعمیل ضروری ہے مگر
ہے یہ علم نبوی تیرے ہی گھر کی دولت خواہ حرمت اسے دے خواہ اہانت اسے کر

ہارون نے امام صاحب کا یہ جواب سن کر ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اچھا ٹھیک ہے آپ تشریف نہ لائیں لیکن جب شاہزادے سماعت حدیث کے لئے حاضر ہوں تو اس وقت کوئی دوسرا شریک درس نہ ہو

سن کے ہارون نے دربار امامت کا جواب بھیجا پیغام کہ خیر آپ نہ آئیں گے اگر
خود یہ شہزادے وہاں درس میں حاضر ہونگے مگر اوروں کا نہ ہو بزم میں اس وقت گزر

امام مالک نے اس تجویز کو اسلامی شان و مساوات کے خلاف قرار دے کر کمال استغناء سے رد کر دیا، اور پوری جرأت سے خلیفہ کو کہلا بھیجا

مالک ابن انس نے اسے کہلا بھیجا مرے کاشانہ میں ممکن نہیں تمیز بشر
درسگہ خاص نہیں درسگہ عام ہے یہ ہو مساوات بشر معنی اسلام ہے یہ

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ پر اشعار

اسی طرح جون ۱۹۱۶ء میں سید صاحب نے ایک نظم ''سراکیات'' کے عنوان سے لکھی، جس میں قوم کی زبان سے مسلمانوں کی غفلت اور ان کے انحطاط کا ذکر کر کے ان کی نشاۃ ثانیہ کی اصل روح بیان کی ہے اور ''چشمۂ حیات'' اور ''قوت بشر'' کی نشاندہی کی ہے

اک شور ہے کہ قوم میں اب زندگی نہیں شیرازۂ جماعت قومی ہے منتشر

قوت نہ بازوؤں میں، نہ سر میں بلند فکر کچھ اضطراب قلب نہ کچھ کاوش جگر

اے چارہ گر تغافل دیریں سے ہوشیار معلوم ہے نہ رمز حیات امم مگر
مانا کہ آبلوں سے ہیں تلوے بھرے ہوئے چرکے لگے ہوئے ہیں، بہت جسم ازد پر
یہ سب صحیح، پر ہے ضروری بقائے روح لازم ہے فکر زخم جگر سب سے پیشتر
وہ جذب مذہبی ہے وہ ملت کا جوش ہے جو چشمۂ حیات ہے اور قوت بشر
پیدا ہو جب وہ آگ کے شعلہ کی شکل میں ہوجائے جب وہ برق کی صورت میں جلوہ گر
ان سست بازوؤں میں پہاڑوں کا زور ہو ان مضمحل قوی میں ہو طوفان کا اثر

دریائے نربدا پر ایک نظم

جولائی ۳۳ء میں سید صاحب راندیر اور سورت کے ایک علمی سفر پر تشریف لے گئے، اور جب وہاں سے بھروچ جارہے تھے تو راستہ میں دریائے نربدا کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور اُن کو اپنے کاروان رفتہ کی یاد آئی اور اسی عنوان سے ایک نظم کہہ ڈالی، جس کے شروع میں کہتے ہیں۔

نربدا، اے نربدا، اے جادۂ بحر عرب گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحر عرب
ہاں گزشتہ کارواں کا تو نشانِ راہ ہے ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز تیرے دروازے پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
اے بھروچ، اے خاتم انگشت رودنربدا عہد ماضی کی تری عزت رہے قائم سدا

سید صاحب کی رباعیات

رباعیات وقطعات میں بھی سید صاحب کی فکر سخن نے اپنی جولانی دکھائی ہے، چنانچہ

۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کا مشہور حادثہ پیش آیا تو اس پر مولانا حالی، نواب علی حسن خاں، خواجہ عزیز الدین، اقبال سہیل اور مولانا عبدالسلام ندوی نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں اس وقعہ کی عجیب عجیب لطیف توجیہات کی گئی تھیں۔ علامہ مرحوم نے یہ تمام رباعیاں سید صاحب کو دیدیں، جنہوں نے ان کو ستمبر و اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں شائع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں خود سید صاحب نے بھی اپنے محسن و مربی کے اس عظیم المیہ پر دلی تاثرات شعری سانچے میں ڈھالے تھے، خود رقمطراز ہیں:

خاکسار شاعر نہیں، اس پر بھی کچھ کہا تھا جس کو ادبا یا مولانا کی تنقید کے ڈر سے پیش نہیں کیا۔ اسی مہینہ موازنہ انیس و دبیر شائع ہوئی تھی اسی کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا:

نقید مراثی کے صلہ میں استاد دربار حسینی میں سعادت بخشی
پرسر سے ابھی کام تھا لینا باقی اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی (۳۴)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نکاح کے موقع پر سید صاحب نے جو قطعات موزوں کئے تھے اُن میں سے دو قطعات ملاحظہ فرمائیں

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد نوشاہ بنیں گے آج عبدالماجد
اللہ کرے وہ دن بھی جلد آجائے بن جائیں گے وہ جب کسی کے والد ماجد

دنیا پہ کرے جو غور کوئی تھوڑا پائے گا ہر ایک شئے کو جوڑا جوڑا
دعویٰ تھا مرے دوست کو یکتائی کا اللہ نے اب غرور ان کا توڑا

سید صاحب کی عربی و فارسی شاعری

سید صاحب نے اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی شاعری کی ہے۔ ۱۹۰۳ء میں جب نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ کی تعلیم کا معائنہ کرنے تشریف لائے تو سید صاحب نے جو

اس وقت طالب علم تھے نواب صاحب موصوف کی شان میں ایک عربی قصیدہ سنایا جسے سن کر نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے۔(۳۵) اسی طرح ۱۹۰۵ء میں جب علامہ شبلی حیدر آباد کی ملازمت سے قطع تعلق کر کے ندوہ میں مستقل قیام کے لئے تشریف لائے تو سید صاحب نے اُن کے خیر مقدم میں ایک طویل قصیدہ فارسی میں کہا، جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

بیانش ابر باراں است کی بخشد چومی بارد   بیوم شور سرسبزی و سبزہ را فراوانی
مسیحا دم با عجاز قلم جاں زگر بخشد   بحکم قم باذن العلم آں تن را کہ شدفانی
بخواہم از خداوندے کہ ناش حی و قیوم است   بماند زندہ جاویدا یں شبلی نعمانی
نوشتم چوں مدیح حضرت الاستاذ برخواندم   ندا آمد مرا ازپردۂ ناموس ربانی
دلیل فضل ممدوحت زمدح تو ہوید اشد   بہ پیش مورسر تہ نہی کہ ہمنام سلیمانی

۱۹۴۹ء میں سید صاحب نے فارسی میں ایک الہامی غزل کہی تھی، اس کے نیچے گوشہ میں ''بوقت خاص'' مرقوم ہے۔اس اشارہ کی رمز کشائی کرتے ہوئے وہ خود فرماتے ہیں کہ''انیسویں شب رمضان کو نماز تہجد پڑھ کر ذکر کرنے بیٹھا ہی تھا کہ دفعتاً یہ پوری غزل قلب پر وارد ہوئی۔فارسی میں میری صرف یہی ایک غزل ہے۔اس مرصع غزل کو دیکھ کر ایک سخن سنج نے کہا تھا کہ:''اس پر تو عراقی کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔'' چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ؎

شیوۂ صید زبونم آرزو ست   سینہ آغشتہ بخونم آرزو ست
گوشہ می جوید پیام از وصل دوست   ارجعی وار جعو نم آرزو ست
خوش نمی آید سجود بے حضور   فی صلوٰۃ خاشعونم آرزو ست
از حصاراین و آں بیروں کشد   آن نگاہ پر فسونم آرزو ست
خبر من ہست آنچہ توفر مودہ   آنچہ فرمودی ہمونم آرزو ست

سید صاجب کی شاعری کا مقام

سید سلیمان ندوی کے اعلیٰ ذوق سخن اور اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں قدرت

کلام کے تمام تر اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے علم وادب، اور تحقیق وتصنیف کے میدان میں جو روشن اور لافانی کارنامے انجام دیئے ہیں ان کے مقابلہ میں ان کی شاعری کم مایہ اور فروتر ہے۔ سید صاحب اگر صرف شاعری کی طرف توجہ کرتے تو وہ اپنے عہد کے آتش وحسرت نہ سہی، امیر مینائی اور جلال ضرور ثابت ہوتے لیکن بصورت موجودہ سیرت النبی، ارض القرآن، خیام، عرب و ہند کے تعلقات اور حیات شبلی کی رنگارنگ نقش آرائیوں کے سامنے ''ارمغان سلیمان'' کی چاندنی بے کیف اور گہن آلود محسوس ہوتی ہے۔

شاعری کو مقصد نہ بنانے کی وجہ

یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب جس درجہ کے مصنف ومحقق اور ادیب تھے، اس مرتبہ کے شاعر نہ تھے، اور نہ وہ خود اس درجہ کے شاعر بننا ہی چاہتے تھے۔ اسی لئے حقیقت یہ ہے کہ بے شمار علماء کرام اور ممتاز مذہبی رہنماؤں کی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی یہ صفت ودیعت فرمائی تھی، مگر علماء کرام کے طرز کے مطابق انہوں نے بھی شاعری کو اپنا مقصد اور محور نہیں بنایا، بس کبھی کبھار خیالات وجذبات کے اظہار کے لئے اسے استعمال کیا۔

جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب کا اور حضرت امام شافعیؒ کے دیوان موجود ہیں، مگر ان حضرات نے شاعری کو اپنا مقصد اور پہچان بنانے کے بجائے علمی پہچان کو اختیار کیا، اور علم کے نشان کہلائے۔ بلکہ علماء کو شاعری کو مقصد بنانا علماء کے لئے عیب شمار کرتے تھے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کا مشہور شعر ہے

لولا الشعر بالعلماء یزری لکنت الیوم اشعر من لبید (۳۶)

ترجمہ: اگر شعر علماء کی شان کے لئے عیب نہ ہوتا تو میں آج لبید سے بڑا شاعر ہوتا۔

اسی لئے سید سلیمان ندویؒ کی شاعری سے بے اعتنائی کو اسی زمرے میں لیا جانا چاہئے، ورنہ وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ اللہ تعالیٰ ندویؒ کو اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سید سلیمان ندوی، میں جن سے متاثر ہوا، شائع شدہ معارف، ۱۹۵۰ء، ص ۶
۲۔ ارمغان سلیمان، مضمون معارف، جولائی ۱۷ء، ص ۱۲
۳۔ بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات، مضمون معارف، سلیمان نمبر، ص ۴۸
۴۔ سید الملت کی مکتبی زندگی مضمون ''ریاض'' کراچی سلیمان نمبر، ص ۲۲
۵۔ بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات مضمون ''معارف'' سلیمان نمبر، ۴۹، از ابوظفر
۶۔ ایضاً، ص ۵۳
۷۔ ایضاً، ص ۴۹
۸۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد، ص ۷
۹۔ میں جن سے متاثر ہوا، مضمون ''معارف'' جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۷
۱۰۔ سید صاحب کی یاد میں، مضمون ''معارف'' نومبر ۱۹۵۹ء، ص ۳۴۲
۱۱۔ ارمغان سلیمان، معارف، جولائی ۱۷ء، ص ۱۰
۱۲۔ بچپن اور طالب علمی کے واقعات مضمون ''معارف'' سلیمان نمبر، ص ۵۳
۱۳۔ نقوش مضمون ''معارف'' سلیمان نمبر، ص ۲۳۰
۱۴۔ میں جن سے متاثر ہوا، معارف، جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۱۱
۱۵۔ ارمغان سلیمان، غلام محمد، ص ۲۳۲
۱۶۔ ارمغان سلیمان، ص ۱۱
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱
۱۸۔ نقوش سلیمانی، مضمون ''معارف'' سلیمان نمبر، ص ۲۳۱
۱۹۔ ارمغان سلیمان، ص ۱۲
۲۰۔ میں جن سے متاثر ہوا، معارف، جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۶

۲۱۔ ارمغان سلیمان، مضمون، شاہ معین احمد معارف، ۵۰ء، ص ۶
۲۲۔ سید سلیمان ندوی، ص ۲۶۲، از ڈاکٹر نعیم صدیقی
۲۳۔ ارمغان سلیمان، معارف، جولائی ۱۹۷۱ء،
۲۴۔ اقبال نامہ، ص ۷۷
۲۵۔ ارمغان سلیمان، غلام محمد، ص ۷
۲۶۔ حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام، معارف، سلیمان نمبر، ص ۳۲۷
۲۷۔ تذکرہ سلیمان، ص ۱۲۲
۲۸۔ ارمغان سلیمان، مقدمہ، ص ۹
۲۹۔ ارمغان سلیمان معارف، جولائی ۷۱ء، ص ۱۴، از شاہ معین الدین احمد
۳۰۔ ایضاً
۳۱۔ تصوف اور شاعری، ص ۳۱
۳۲۔ ارمغان سلیمان معارف، سلیمان نمبر، ۱۹۷۱ء
۳۳۔ مقدمہ شعر و شاعری، ص ۵۰، از حالی
۳۴۔ حیات شبلی ص ۴۷۰
۳۵۔ حیات سلیمان، ص ۱۹، از شاہ معین
۳۶۔ دیوان شافعیؒ، جہاں دیدہ از مولانا محمد تقی عثمانی

کتابیات:

۱۔ مجلہ معارف: مختلف مضامین، جولائی ۱۹۵۰ء، ۱۹۷۱ء
۲۔ ارمغان سلیمان مضمون مجلہ معارف، جولائی ۷۱ء
۳۔ بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات، سید ابو ظفر
۴۔ سید الملت کی مکتبی زندگی، مناظر احسن گیلانی

۵۔ حیات سلیمان، شاہ معین احمد
۶۔ سید صاحب کی یاد میں، سید نجم الہدیٰ
۷۔ میں جن سے متاثر ہوا، سید سلیمان ندویؒ
۸۔ نقوش سلیمانی، از عبدالماجد دریابادیؒ
۹۔ حسرت موہانی حیات و کارنامے، احمر الاری
۱۰۔ مکاتیب امیر مینائی، احسن اللہ ثاقب
۱۱۔ امیر مینائی، (ادبی پریس لکھنو)، ممتاز علی آہ یا
۱۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ابواللیث صدیقی
۱۳۔ مطالعہ امیر (لکھنؤ)، ابومحمد سحر
۱۴۔ ارمغان سلیمان، غلام محمد
۱۵۔ اقبال نامہ، شیخ عطاء اللہ
۱۶۔ حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام، سید حسین
۱۷۔ تذکرہ سلیمان، لکھنؤ، غلام محمد
۱۸۔ تصوف اور شاعری (علی گڑھ) وحید اختر
۱۹۔ آئینہ معرفت (الہ آباد)، اعجاز حسین
۲۰۔ آب حیات (الہ آباد)، محمد حسین آزاد
۲۱۔ مقدمہ شعر و شاعری، الطاف حسین حالی
۲۲۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی
۲۳۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین ندوی
۲۴۔ جہان دیدہ، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی
۲۵۔ دیوان شافعی (بیروت)، امام محمد بن ادریس اشافعی،